ڈاکٹر محمد ریاض

شبلی اور معاصر سیاسی حالات

علامہ شبلی نعمانی کی شاعری، مکتوبات اور مقالات میں معاصر سیاسی حالات کے بارے میں دلچسپ تبصرے اور تجزیے ملتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے مکتوبات، مقالات اور فارسی اشعار کی تعداد زیادہ نہیں، مگر ان کی اُردو شاعری کا نصف سے زیادہ حصہ سیاسی موضوعات سے ہی مربوط ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم نے اپنی تالیف "شبلی نامہ"[۵۱] اور کوئی ۲۵ سال بعد شائع ہونے والے اس کے نقشِ ثانی "یادگار شبلی"[۵۲] میں اس موضوع کو مالاجمال چھیڑا ہے۔ مگر شبلی کی اردو سیاسی شاعری کے کئی مضامین پر انھوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ راقم الحروف اس فرصت میں شبلی کے مکتوبات، مقالات اور کلیات[۵۳] (اردو اور فارسی) پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے بعض نکات سے بحث کرے گا۔

عالمِ اسلام

عالمِ اسلام کے جن معاصر واقعات پر شبلی نے طبع آزمائی کی، ان کا تعلق بلقان اور طرابلس کی جنگوں، خلافت عثمانی کی حمایت اور مسلمانانِ عالم کے اضمحلال سے ہے۔ شبلی کی اس شاعری کا تعلق ان کی زندگی کے آخری چند سالوں سے ہے (وفات ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء) مگر ترکوں کی حمایت اور معاصر عثمانی خلیفہ عبد الحمید خان ثانی کی مدح میں وہ اس سے پہلے بھی لکھتے رہے ہیں۔[۵۴] ۱۸۹۲ء میں شبلی نے کوئی چھ ماہ تک ترکی اور بعض عرب ممالک میں قیام کیا اور اپنے مشاہدات کو "سفرنامہ روم و مصر و شام" نام کی کتاب میں منضبط فرمایا۔ اس کتاب میں بھی وہ ترکوں اور معاصر خلیفہ و امرا کی خوبیاں بیان کرنے میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

---

۵۱ مطبوعہ شیخ نذیر مالک کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳۔ سال طباعت درج نہیں (بظاہر ۱۹۴۶ء؟) اور صفحات ۲۷۶ ہیں۔

۵۲ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور ۱۹۷۱ء صفحات ۴۵۶ (بڑی تقطیع)

۵۳ کلیاتِ شبلی (اُردو) طبع سوم اعظم گڑھ ۱۹۴۰ء — کلیاتِ شبلی (فارسی) کان پور، ۱۹۱۶ء

۵۴ کلیاتِ شبلی (اُردو) قطعہ صفحہ ۱۲۰ نوشتہ بظاہر ۱۸۷۸ء ملاحظہ ہو۔

کہتے ہیں کہ سر آغا خان سوم مرحوم نے ریاست ہائے بلقان کی جنگ کے زمانے میں ایک مضمون لکھا جس میں منجملہ دیگر امور کے ایک بات انھوں نے یہ لکھی کہ ترکوں سے یورپ والے اس لیے رقابت اور ہم چشمی کرتے ہیں کہ یہ ایشیائی بھی ہیں اور یورپی بھی، اور یورپ والے ترکوں کی سابقہ تاخت و تاراج کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اگر ترک اپنے یورپی علاقوں سے دست بردار ہو جائیں اور مکمل طور پر ایشیائی بن جائیں تو یورپ کے ممالک ان کے ساتھ مخاصمت کرنا چھوڑ دیں گے۔ سر آغا خان سوم کی اصل تحریر ہمارے سامنے نہیں، مگر اس کے خلاف کئی مسلمانوں کی تحریریں موجود ہیں۔ علامہ شبلی نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں اس قول کا استہزا کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یورپ کے علاقوں سے دست کشی ہر قسم کی علمی اور فنی ترقی سے بھی دست کشی ہے۔ جناب آغا خان خوب مشورہ دیتے ہیں کہ ترک مکمل طور پر ایشیائی بن جائیں اور دنیا کی ہر قسم کی ترقی کے ہنگامے سے بھی کان بند رکھیں:

ترک سے حضرت آغا نے یہ ارشاد کیا — کیوں ہو بے فائدہ یورپ میں گرفتارِ الم؟
ایشیا میں اگر آجاؤ تو پھر تا ابد — پاؤں پھیلا کے پڑے چین سے سوؤ گے، چہ غم؟
نظر آجائے گی بے کاریِ آلاتِ جدید — جب کہ تم وادیِ تاتار میں رکھو گے قدم
ریل یا تار کی پھر ہوگی نہ حاجت تم کو — ڈاک پہنچانے کو آجائیں گے مرغانِ حرم
فیصلہ بیٹھ کے چوپال میں کردے گا جو پنچ — ہوگا یورپ کے خوانین سے بڑھ کر محکم
اور مانا بھی کہ فردوسِ بریں ہے یورپ — حضرت خواجۂ شیراز یہ کرتے ہیں رقم
"پدرم روضۂ رضوان بہ دو گندم بفروخت — ناخلف باشم اگر من بہ جوے نفروشم"

گفت با ترک حضرتِ آغا — آنچہ بگویم بگوش درگیرید
بگزارید خاکِ یورپ را — دل ازین مرز و بوم، برگیرید
ایشیا مسکنِ قدیم شما ست — باز آن خاک را مقر گیرید
"کار دنیا کسے تمام نکرد — ہر چہ گیرید، مختصر گیرید"

ان قطعات کے صرف چند اشعار نقل کیے گئے ہیں، مگر دونوں کا مفاد یکساں نوعیت کا ہے۔

۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کو ترکوں نے ایڈریانوپل کو فتح کیا تھا۔ شبلی نے اس موقع پر ایک پانچ شعری قطعہ لکھا اور ترکوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اے ترک، اے مجسمۂ کبریائے حق — اے وہ کہ جس پہ عالم ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہِ ملّتِ ختم الامم ہے تو — تو آج زورِ بازوئے شاہِ حجاز ہے

جنگ بلقان کے زمانے میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں برّصغیر کے مسلمانوں کا ایک طبی وفد ترکی گیا تھا۔ اس وفد نے ترک زخمیوں کی مدد کی۔ یہ وفد جب بمبئی پہنچا تو اس کے استقبال کرنے والوں میں شبلی بھی تھے — اس موقع پر انھوں نے ایک خیر مقدمانہ ترکیب بند پڑھا۔ دونوں بندوں کے ۲۷ اشعار ہیں اور ان میں شاعر وفد کے ممبروں کے لیے سراپا تحسین و آفریں ہے کہ انھوں نے شہیدوں اور غازیوں کی خدمت کی ہے۔ آخر میں شبلی ترکوں کی مزید کامیابی کی امید کرتے ہیں، اور ان کے لیے دست بدعا بھی ہوتے ہیں:

سہارا ہے اگر اُمید کا اب بھی کوئی باقی — تو تم نے وہ رموزِ قوتِ مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہوکر پھر اُچھل آئے — کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں
دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبولِ یزدانی — تو اب دستِ دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

جنگِ بلقان کے دوران وزرائے برطانیہ نے برّصغیر کے مسلمانوں کے احساسات کے بارے میں ایک بحث کی تھی، مگر انھوں نے اس بات پر اظہارِ تعجب کیا کہ جنگ میں تُرک ملوّث ہیں، اور برّصغیر میں اس قدر بے چینی ہے۔ شبلی فرماتے ہیں کہ دینِ اسلام کی عالمگیریت کا یہی تقاضا ہے کہ مسلمان اپنے دنیا بھر کے دینی بھائیوں کے غم خوار ہوں، مگر وزرائے برطانیہ کو اس کا کیا پاس ہوگا؟۔ ان حالات میں شبلی فرماتے ہیں:

مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالم گیریٔ ملّت — عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک ہے
پڑا سوتا ہے کوئی گنبدِ خضرائے یثرب میں — کہ جس کا بندۂ فرماں زمیں سے آسماں تک ہے
کوئی جاکر کہہ دے ہم گنہگاروں کی جانب سے — کہ اب مسلم کی ہستی تیرے الطافِ نہاں تک ہے

ان دنوں برّصغیر کے مسلمان وزرائے برطانیہ کے انتقادات پر برہم تھے، مگر بمبئی کی ایک گم نام سی اسلامی انجمن نے برطانیہ والوں کی ہم نوائی شروع کی۔ شبلی نے اس انجمن کے بارے میں بھی ایک طنزیہ قطعہ لکھا ہے۔

ہو مبارک تجھے اے بمبئی اے نازِ دکن — کہ ترے تاج میں ہے طرّۂ سلطانی بھی

تیرے بازار میں وہ یوسفِ گم گشتہ ملا جس کا مشتاق تھا خود یوسفِ کنعانی بھی
یہ الگ بات ہے، اندھوں کو وہ آئے نہ نظر گو اسی زمرہ میں ہے یوسفِ ثوبانی بھی

مگر اس ضمن میں شبلی کی سب سے زوردار نظم وہ ہے جو بلقان اور طرابلس کی مسلم کش جنگوں سے متاثر ہو کر انھوں نے لکھی اور اس کا عنوان "شہر آشوبِ اسلام" رکھا۔ اس کے کوئی دو درجن اشعار ہیں اور سب عجیب سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس نظم کو شبلی نے لکھنؤ کے ایک جلسۂ عام میں پڑھا تھا اور بڑا رقت بار سماں پیدا کیا تھا، مگر مجموعی حیثیت سے اس نظم پر مایوسی کے بادل چھائے ہوئے ہیں اور بلقان اور طرابلس کی جنگوں کے بعد ترکوں، عربوں اور دوسرے مسلمانانِ عالم کے پنپنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ سخت جاں کب تک
یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو یہ ظلم آرائیاں تاکے، یہ حشر انگیزیاں کب تک
کہاں تک لوگے، ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
زوالِ دولتِ عثمان، زوالِ شرع و ملت ہے عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خان و ماں کب تک
پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک
کہیں اُڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے جائیں، تو شبلی اب کہاں جائیں کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

مسجد کان پور کا حادثہ

مئی ۱۹۱۲ء میں کان پور کے محلہ مچھلی بازار میں ایک مسجد کے وضو خانے کے انہدام کا حادثہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ ایک نئی سڑک نکالنے کے سلسلے میں حکام کے حکم سے اس وضو خانے کو گرا دیا گیا۔ مسلمان انگریزوں کی ترک دشمن پالیسی پر پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ اس واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ چنانچہ ۳ مئی ۱۹۱۲ء کو ہر سن و سال کے مسلمانوں کا ایک جمِ غفیر مسجد کے گرد جمع ہو گیا اور اس نے منہدم شدہ مسجد کی دیوار اور وضو خانے کو دوبارہ تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ مگر انگریزی حکومت کی پولیس یا فوج نے

مسلمانوں کے مجمع پر اندھا دھند گولیوں کی بوچھاڑ کر دی، جس سے متعدد بچے، جوان اور بوڑھے شہید اور زخمی ہو گئے۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر کئی شاعروں اور اہلِ قلم نے ماتم کیا جن میں شبلی بھی شامل ہیں۔ علامہ شبلی نے شہید لئے کان پور کے بارے میں چھوٹی بڑی ایک درجن سے زیادہ اردو اور فارسی نظمیں اور قطعے لکھے ہیں اور ان کی کئی نظمیں اور قطعے بے حد معروف و مقبول رہے ہیں۔ حادثہ کان پور کا ہنگامہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وائسرائے ہند کو صلح و آشتی کی کوشش کرنا پڑی تھی۔ اس کے نتیجے میں نیچے سڑک بنائی گئی اور اوپر مسجد کی چھت۔

ایک قطعے میں شبلی فرماتے ہیں کہ حکام کے نزدیک مسجد کا وضو خانہ معمولی چیز سہی، مگر مسلمانوں کے نزدیک وہ بھی مسجد کا ایک اہم جزو اور محترم و عزیز ہے۔

گفتی کہ وضو خانہ بہ تعظیم نیرزد[۵۵] زاں رو کہ آن خانہ نہ مسجد نہ کنشت است
مابندۂ فرمانِ تو ہستیم و لیکن معشوق من آنست کہ نزدیک تو زشت است (سعدی)

ذیل کے دو دو شعری تین قطعے دیکھیے اور حادثہ کان پور پر شبلی کے احساسات کا اندازہ لگائیے۔ بلکہ وطن میں اس دردناک حادثے کے پیش آنے کے باوجود، شاعر ریاست ہائے بلقان کے مسلمانوں کے دکھ درد کو بھی نہیں بھولا۔ تیسرے قطعے میں شبلی اپنے پاؤں کے کٹ جانے کے حادثے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ انھیں افسوس ہے کہ ہنگامہ کان پور میں شرکت نہ کر سکے ورنہ اسیری کا فخر تو شاید حاصل کر ہی لیتے۔

کیا پوچھتے ہو کہ رسولِ عرب کی قوم کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں
سُن لو وہ گنجہائے گراں مایہ دفن ہیں کچھ بلقان کی خاک میں، کچھ کان پور میں

اگر چہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خون کہ کان پور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہے دشوار ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں

---

۵۵ اردو میں بھی انھوں نے یہ باتیں لکھی ہیں، جیسے

لوگ کہتے ہیں کہ حکام ہیں آمادۂ صلح یہ اگر سچ ہے تو چندہ خوبی تقدیر نہیں
جزو مسجد کو گر آپ سمجھتے ہیں حقیر آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں
آپ کہتے ہیں وضو خانہ تھا مسجد بھی یہ بجا مسئلہ فقہ کی تعبیر نہیں

پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ — یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل بھی نہیں

ایک قطعے میں شبلی عالمانِ دین کی گرفتاری کو حضرت زین العابدینؓ کی اسیری کے مشابہ قرار دیتے ہیں اور نابالغ بچوں کی شہادت پر عجیب دل گداز اور رقت بار انداز میں تبصرہ کرتے ہیں۔

پہنائی جا رہی ہیں عالمانِ دین کو زنجیریں — یہ زیور سید سجادؑ عالی کی وراثت ہے
شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے — عروسِ مسجدِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں — کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

دو دو شعر کے دو فارسی قطعوں میں شبلی نے مسجد کے حادثے کو بنگال کی تنسیخ کے معاملے سے منسلک کیا اور انگریز کی دوگونہ پالیسی پر انتقادِ ملیح کیا ہے۔ یو پی کے گورنر سر جیمس مسٹن کو اپنے محکم فیصلے پر بڑا ناز تھا کہ مسجد کے متوضی کے انہدام کا جو فیصلہ کر دیا گیا، اسے کالعدم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شبلی کہتے ہیں کہ وائسرائے لارڈ کرزن نے ۱۹۰۵ء میں جب تقسیم بنگال کا اعلان کیا تو غیر مسلموں کی مخالفت کے رونما ہونے پر برطانیہ کے وزیر اعظم نے یہی کہا تھا کہ ہم فیصلے بدلا نہیں کرتے۔ مگر ۱۹۱۱ء میں جب برطانیہ کے تاجدار نے دہلی میں دربار لگایا اور تاجپوشی کی تو تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر کے غیر مسلموں کی مسرت کا سامان بہم پہنچا دیا۔ (لات، انگریزی لفظ لاٹ کا مفرس ہے):

جنابِ "لات" از فرمودۂ خود بر نمی گردد — کہ تمکین حکومت را سیاست بیشتر باید
ولے در قسمت بنگالہ این اندیشہ می بایست — کہ اگر بازگشتن اوّل روزمی باید اگر باید،

حضرت "لات" بفرمود کہ فرمان فرمائے — نیست ممکن کہ دگر بگزرد از گفتۂ خود
صدرِ اعظم بسوئے قسمت بنگالۂ شرق — نگہے کرد و بفرمود کہ "من کردم و شد"

وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے جب مسجد کانپور کے تنازعے کا فیصلہ کروایا اور قیدیوں کی آزادی کا اعلان کیا تو اس وقت شبلی نے تشکر آمیز جذبات پر مشتمل ایک نظم لکھی تھی کہ:

تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست — یہ حقیقت میں ظفر مندیٔ سلطانی ہے۔
بات سکھ لی تری تقریر نے حکام کی بھی — گوچہ لازم افضلیں اظہارِ پشیمانی ہے
گرچہ مدحِ امرا میں نے نہیں کی ہے کبھی — شکر احسان مگر فطرتِ انسانی ہے

مگر اس ضمن میں شبلی کا دردناک ترین قطعہ حسب ذیل ہے۔ اس کا آخری مصرع مثل کی طرح

مشہور ہے اور پوری نظم شاعر کے دردِ دل کی مظہر ہے :

کل مجھ کو چند لاشۂ بیجاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں

کچھ طفلِ خرد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے منتظرِ نفخ صور ہیں

کچھ نوجوان ہیں، بے خبر نشۂ شباب
ظاہر ہیں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں

اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے، مگر ہم ضرور ہیں

سینہ پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار
از بسکہ مستِ بادۂ ناز و غرور ہیں

ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناسِ ذوقِ دلِ ناصبور ہیں

کچھ پیرِ کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک و خون میں بھی ہمہ تن غرقِ غور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں

شبلی کی سیاسی شاعری کے تین چار موضوعات اور ہیں: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا قیام، ندوۃ العلما، احرار اور مسلم لیگ ۔ اس کے علاوہ پہلی عالمی جنگِ عظیم کے دوران اگست ۱۹۱۴ء میں شبلی نے ایک نظم لکھی تھی اور جرمنوں اور ان کے حلیفوں کا پلہ بھاری ہونا بتایا تھا، مگر بعد میں نتیجہ بھی یہی نکلا :

اک جرمنی[65] نے مجھ سے کہا از رہِ غرور
آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں

برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں

باقی رہا فرانس، تو وہ رندِ لم یزل
آئیں شناسِ شیوۂ پیکار بھی نہیں

میں نے کہا، غلط ہے ترا دعویٔ غرور
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دہ گُنے
تجھ کو تمیزِ اندک و بسیار بھی نہیں

سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور
پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں" (غالب)

شبلی کی ندوۃ العلما لکھنو کے کاموں میں شرکت، اگست ۱۹۰۴ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک "الندوہ" نام

---

[65] جرمن کے بجائے جرمنی ضرورتِ شعری کے طور پر لایا گیا ہے اور آگے جرمن بجائے جرمنی ۔

کے علمی اور دینی مجلے کی ادارت اور آخر میں اختلافات کی بنا پر اس ادارے سے ان کی علیحدگی کے بارے میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کافی لکھ چکے۔ علی گڑھ تحریک سے شبلی کے ائتلاف و اختلاف کے بارے میں کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ اس ضمن میں مکاتیبِ شبلی جلد دوم اور مقالاتِ شبلی جلد ہشتم (ہر دو مطبوعہ اعظم گڑھ) میں مندرج کئی تحریریں بھی گرہ کشا ہیں۔ کلیاتِ شبلی (اردو اور فارسی دونوں) میں ان موضوعات پر کافی منظومات اور ابیات موجود ہیں۔ بعد کے اختلافات سے قطع نظر شبلی مدتوں علی گڑھ کالج اور ندوۃ العلما دونوں کے ہمدرد اور بہی خواہ رہے ہیں۔ انھوں نے کالج میں کوئی سولہ برس تک تدریس بھی کی اور دیگر نظموں کے علاوہ، ان کی مثنوی 'صبح امید' ہی اس کالج اور اس کے بانی سر سید احمد خان کا آج بھی ایک گراں قدر توصیف نامہ قرار پا سکتی ہے۔ سر سید احمد خان مرحوم (وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) کے دورِ حیات میں شبلی نے علی گڑھ کالج کی توصیف اور اس کے لیے مالی اعانت جمع کرنے کے سلسلے میں کئی نظمیں لکھی اور پڑھی تھیں، مگر اس دور کے بعد کی ان کی نظمیں تعریضی اور طنزیہ ہیں:

مسلم یونیورسٹی

شبلی کے اشعار میں مندرجہ ذیل امور کی طرف اشارے ہیں:

۱۔ کالج کے یونیورسٹی بن جانے کی صورت میں اس کے نام کے بارے میں، حکومت علی گڑھ یونیورسٹی کے نام پر اصرار کرتی تھی جبکہ مسلمان لفظ مسلم کا اضافہ چاہتے تھے (مسلم یونیورسٹی)

۲۔ یونیورسٹی کے ساتھ برصغیر کے تعلیمی اداروں کا مسئلہ۔ حکومت اس یونیورسٹی کے منطقہ الحاق کو دیگر یونیورسٹیوں کی طرح رکھنا چاہتی تھی مگر مسلمانوں کا اصرار تھا کہ برصغیر بھر کے کالج اور سکول اس سے الحاق رکھنے کے مجاز ہوں۔

۳۔ مسلمان مجوزہ یونیورسٹی کے عمل دخل میں آزادی کے قائل تھے، مگر حکام چاہتے تھے کہ سرکار کے نامزد افراد کو قوتِ فیصل حاصل ہو۔

۲۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کو ان ہی مسائل پر غور کرنے کے لیے راجا صاحب محمود آباد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد ایسے زعما کا ایک اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں جوہر اور ابوالکلام ایک طرف تھے اور اربابِ علی گڑھ (راجا صاحب محمود آباد کی قیادت میں) ایک طرف، مگر ایک دن کے وقفے کے بعد جوہر علی گڑھ والوں کے ہم نوا ہو گئے اور ابوالکلام تنہا رہ گئے۔ دونوں سردارانِ احرار، مولانا جوہر اور مولانا آزاد، شبلی کے بمنزلہ

تلامیذ تھے مگر استاد نے ان "احرار" کے عدمِ استقامت پر ایک پوری نظم لکھی اور آخر میں فرمایا:

احرار کا طریقِ عمل ہے اگر یہی — پھر کامیابیوں کا عبث انتظار ہے

سر آغا خان سوم مرحوم نے علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے کے لیے بے حد کوشش کی تھی۔ انھوں نے سرسید احمد خاں کی طرح برصغیر کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور مختصر مدت میں تیس لاکھ روپیے کی خطیر رقم اکٹھی کی تھی۔ وہ جب لاہور آئے، تو شبلی بھی ان کے ساتھ تھے اور مولانائے موصوف نے یونیورسٹی فنڈ میں لوگوں کو مدد دینے کی تحریک کرنے کے ضمن میں فارسی میں ایک زوردار نظم بھی پڑھی تھی۔ مگر شبلی کے نزدیک نصابِ تدریس اہم تھا۔ "مسلم" نام اور مسئلہ الحاق کو وہ چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس قسم کی مساعی کا استہزا کیا ہے جو نام یا الحاق کے سلسلے میں کی جا رہی تھیں۔ دو نظموں میں انھوں نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے رویے پر طنز کی ہے۔ خواجہ صاحب اس تحریک کے خلاف تھے جو کالج کے مسائل حل کرنے کے لیے وائسرائے سے ملاقات کے لیے ایک وفد بھیجنے کے سلسلے میں چلائی جا رہی تھی، مگر جب خود ان کا نام وفد کے ارکان میں شامل کیا گیا تو وہ اس وفد کی افادیت کی باتیں کرنے لگے۔ شبلی نے دو نظمیں اسی سلسلے میں لکھی ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے نصاب کے بارے میں انھوں نے اس زمانے میں درج ذیل نظم لکھی اور اس کے ذریعے غیر نصابی سرگرمیوں کا استخفاف کیا ہے:

ہمارے لیڈروں کے مشغلے اب بڑھتے جاتے ہیں — کہ اب سازش کی بھی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے
ہماری مجلسِ قومی کے جب اجلاس ہوتے ہیں — تو اخلاقی قواعد میں بھی کچھ ترمیم ہوتی ہے
بٹھائے جاتے ہیں کالج کے لڑکے صدر و پائیں ہیں — سکھائی جاتی ہے جو کچھ نئی اسکیم ہوتی ہے
ادھر اسٹیج پر سرگوشیاں ہوتی ہیں آپس میں — اشاروں میں ادھر فردِ عمل تقسیم ہوتی ہے
طلسمِ چشم و ابرو کے جو اسرارِ نہانی ہیں — نو آموزوں کو ان کی رمز بہ رمز تعلیم ہوتی ہے
کسی پر تالیاں بجتی ہیں تحقیر و اہانت کی — کسی کی ہر ادا پر عزت و تکریم ہوتی ہے
کسی آزاد گو کے کان میں کچھ پھونک دیتے ہیں — کہ جس سے کچھ امیدِ شیوۂ تسلیم ہوتی ہے
شکایت ہوتی ہے جب تشنہ کامانِ تفاخر کو — تو پھر جامِ سفارت میں بھی کچھ تعمیم ہوتی ہے
یہاں تک تو خدا کے فضل سے ہم نے ترقی کی — اب آگے دیکھیے اس فن میں کیا ترمیم ہوتی ہے

ندوۃ العلما لکھنؤ کے بارے میں شبلی کی سیاسی نظمیں اُن کے آخری سالِ حیات (۱۹۱۴ء) سے مربوط

ہیں۔ شبلی اس دینی ادارے کے معتمد تھے۔ مگر ان کی مجوزہ بعض اصلاحات کی مخالفت ہوئی اور بات یہاں تک بڑھی کہ شبلی کو استعفیٰ دینا پڑا۔ لیکن طلبائے ندوہ نے شبلی کی حمایت میں اور انھیں واپس لانے کی خاطر تین ماہ تک ہڑتال کی اور برصغیر کی بعض ریاستوں نے بھی شبلی کے موقف کی حمایت کی۔ شبلی کے حامی "حزب الاحرار" گروہ کی اگرچہ بڑی حمایت تھی، مگر داخلی اختلافات کی شدت کی بنا پر شبلی ندوۃ العلما میں واپس نہ آسکے۔ ان دنوں اربابِ علی گڑھ بھی ندوۃ العلما کی حمایت کرکے شبلی سے اپنے اختلافات کا بدلہ لے رہے تھے، حالاں کہ اس سے قبل ندوۃ العلما اور علی گڑھ کالج میں مکمل مغائرت رہی تھی۔ شبلی نے ان حالات سے اثر پذیر ہو کر کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں فرماتے ہیں کہ اربابِ علی گڑھ کا یہ عمل بغضِ معاویہؓ ہے، اسے حُبِ علیؓ نہیں کہہ سکتے۔

کیا لطف ہے کہ حامیٔ ندوہ ہیں اب وہ لوگ — جن کو کہ اس کے نام سے بھی اجتناب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوہ غریب — اک بیہودہ خیال تھا یا آنکہ خواب تھا
حیرت یہ ہے کہ مجمعِ دہلی میں یہ گروہ[۵۶] — ندوہ کے حل و عقد کا نائب مناب تھا
سرشار ہے حمایتِ ندوہ میں وہ گروہ — جس کو کہ اس کے ذکر سے بھی اجتناب تھا
بُغضِ معاویہؓ ہے، یہ حُبِ علیؓ نہیں — اک ایک کی زباں پہ یہ فصل الخطاب تھا

ایک دوسری نظم میں شبلی ندوۃ العلما کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ اس کی خدمات کو برصغیر کے علمی اور دینی حلقوں کے علاوہ عالمِ عرب میں بھی سراہا جاتا رہا اور ایڈیٹر مجلہ "المنار" (قاہرہ) سید رشید رضا بھی اس ادارے کی دعوت پر برصغیر تشریف لائے، مگر افسوس کہ ان دنوں یہ عالم تاب ادارہ نشانۂ تضحیک بنا ہوا ہے۔ اس نظم کے آغاز میں اربابِ علی گڑھ کے ایک وفد کے معائنہ ندوۃ العلما پر اعتراض کیا گیا ہے۔ بعض والیانِ ریاست کی تحریک پر یہ وفد ندوۃ العلما کے حالات کا جائزہ لینے لکھنؤ گیا تھا اور شبلی کو اس پر دکھ ہوا:

آتا ہے اب معائنہ ندوہ کا مشن — جو اختراعِ مجمعِ حکمت شعار ہے
خود کوزہ گر ہے خود گِل کوزہ بھی ہے وہی — جو صلح ہے وہی روشِ کارزار ہے
کیا شانِ ایزدی ہے کہ وہ ندوۂ علوم — جو مدعیِ رہبریٔ روزگار ہے
جس پر یہ حسنِ ظن ہے کہ ہے مجمعِ کرام — جس کا کہ مصر و شام میں اب تک وقار ہے

---

۵۶ ۱۰ مئی ۱۹۱۴ء کے اجلاس کی طرف اشارہ ہے جس نے ندوۃ العلما میں ہڑتال سے پیدا شدہ صورتِ حال پر غور کیا تھا۔

آیا تھا جس کے شوق میں وہ فاضلِ عرب — جس کا مرقعِ ادبی "المنار" ہے
جس نے بدل دیا روش و شیوۂ قدیم — یہ انقلابِ گردشِ لیل و نہار ہے
آتے ہیں اس کی جانچ کو نا آشنائے فن — جو رہبرِ طریقۂ اصلاحِ کار ہے
اربابِ ریش و جبۂ اقدس کا وہ گروہ — اب چند منشیوں کا اطاعت گزار ہے

"حزب الاحرار" شبلی کا ہم نوا سہی، مگر شاعر نے کئی موقعوں پر اس کی بھی خبر لی ہے۔ ہوا یہ کہ احرار کے بھی دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک حکومت کا "وفد" ہم نوا تھا اور دوسرا مخالف۔ ۲۵ اپریل ۱۹۱۴ء کو جس وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی اور کان پور کی مسجد کے قضیے کو حل کروانے پر اس کا شکریہ ادا کیا، شبلی نے "الہلال" کلکتہ میں ان کے بارے میں لکھا:

احرار اور مدّعیانِ وفا ہیں اور — دونوں کا ہے طریقۂ سود و زیاں الگ
دہلی کی انجمن نے وہ پردہ اُٹھا دیا — قائم ہوا جو معرکۂ امتحاں الگ
جو لوگ ہیں متاعِ خوشامد کے مایہ دار — کھولیں گے اب وہ ملک میں اپنی دکاں الگ
یہ مختصر فسانۂ بزمِ شبینہ ہے — سنیے گا "الہلال" میں یہ داستاں الگ

وفادار وفد کے سپاسنامے (ایڈریس) کا بھی شبلی نے استخفاف کیا ہے اور اس ضمن میں دو دو ابیات پر مشتمل دو قطعے لکھے ہیں، مگر انھیں نقل کرنے سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔

شبلی کے سیاسی اشعار زمیندار (لاہور)، مسلم گزٹ (لکھنؤ)، ہمدرد (دہلی) اور الہلال (کلکتہ) میں شائع ہوتے رہے۔ شاعر کا فرضی نام کشاف یا وصاف لکھا جاتا رہا۔ مگر بعد میں انھوں نے اپنا نام بھی لکھنا شروع کر دیا۔ شبلی کے سیاسی اشعار ابتذال سے پاک ہیں مگر تعجب ہوتا ہے کہ سنجیدہ علمی اور تحقیقی موضوعات پر لکھنے والا یہ عجیب الاذواق شخص روزانہ یا ہفتگی ملکی سیاسی موضوعات پر اس طرح لکھتا رہا جس طرح آج کل کے صحافیوں کا معمول ہے:

رندی و سیہ کاری مستی و نظر بازی — زینگونہ اگر خواہی بسیار ہنر دارم
اے شبلی نعمانی این پردہ دری از چیست ؟ — اینہا کہ ز خود گفتی من نیز خبر دارم